قسط ۴

لکھنؤ کی کربلائیں

عالیجناب شیخ تصدق حسین صاحب حنفی ایڈوکیٹ لکھنؤ

کربلائے مصاحب الدولہ لکھنؤ

یہ کربلا مصری کی بغیہ میں مصاحب گنج کے قریب واقع ہے ،اس کے چاروں طرف کے مقامات جو کسی وقت بہت زیادہ آبادو گلزار تھے اب دستبرد زمانہ سے بالکل سنسان و ویران پڑے ہیں۔اس کربلا میں مصاحب الدولہ نے حضرت عباسؑ کا روضہ تعمیر کرایا تھا جس میں داخلہ ایک عالی شان پھاٹک کے ذریعہ ہوتا ہے جس کے دونوں بازوؤں میں غلام گردش ہے اور سامنے کے رخ وسیع صحن کے بعد اصل روضہ ہے جو درگاہ حضرت عباسؑ واقع رستم نگر کی مشہور عمارت سے بہت مشابہ ہے۔روضہ کے شہ نشین پر ایک نہایت کہنہ مگر خوش نما ضریح سنگ مرمر کی رکھی ہوئی ہے۔روضہ کے اوپر ایک بڑا خشتی گنبد ہے جس کے بالائی حصہ میں سنہری کلسی لگی ہوئی ہے۔غلام گردش اور روضہ کے اوپر قدیم وضع کی منڈیر ہے جس میں محراب دار طاق بنا کر ان پر کمہاروں کی بنائی ہوئی سبز چمک دار روغنی گمز یاں برائے آرائش لگادی گئی ہیں۔

چھوٹے[۱] خاں (انیس الدولہ)اور گھسیٹے خاں (مصاحب الدولہ)دو سگے بھائی قوم کے ڈھاڑی دہلی کے باشندے تھے،چھوٹے خاں غضب کا طبلہ نواز تھا۔اس فن میں وہ استاد پیارے خاں کا شاگرد تھا جو تانسین کے خاندان سے تھے۔ چھوٹے خان بہ عہد دولت حضرت امجد علی شاہ معرفت غلام علی ڈھاڑی مرزا محمد واجد علی ولی عہد سلطنت کا ملازم ہوا۔اس نے اپنے بھائی گھسیٹے خاں کو ملازم رکھوایا اور دونوں بخطاب مصاحبان

خودسر بلند ہوئے ۔ ان دونوں پر ولی عہد کی بہت نظر عنایت تھی اور دونوں ہر دم ان کے ساتھ سائے کی طرح رہتے تھے۔

چھوٹے خاں کا سن بروقت ملازمت تخمیناً ۳۵ برس کا تھا۔ اس کا رنگ سرخ وسفید اور جسم کسی قدر تیار تھا۔یہ خوش طبع،خوش رو، شہ زور، بے حد عیاش اور فن مصاحبت میں طاق تھا۔رفتہ رفتہ مع ہمراہیاں (بہار محفل) کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔

سلطان عالم نے تخت نشینی سے پیشتر ہی چھوٹے خاں کو خانہ کی داروغگی کا خلعت مرحمت کردیا تھا مابعد جب ۱۸۴۷ء میں صاحب تاج وتخت ہوئے تو چھوٹے خان کو انیس الدولہ مونس الملک خانہ زاد خاں بہادر مصاحب خاص حضرت سلطان عالم خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ،اور گھسیٹے خاں کو خطاب مصاحب الدولہ بہادر اور خدمت عرض بیگی اور چھوٹے خاں کو داروغگی کبوتر خانہ و کونخانہ واہتمام خاص مکان مع مکان دار کے عطا ہوئی ۔ ان دونوں بھائیوں کی ترقی وعروج کے متعلق سید کمال الدین حیدر قیصر التواریخ کی جلد دوم میں تحریر کرتے ہیں :۔انیس الدولہ، مصاحب الدولہ، قطب الدولہ، وہاج الدولہ، ثابت الدولہ، وغیرہ وغیرہ سب ارباب نشاط کو خدمات عالیہ ملیں۔قطب الدولہ کو کچھ علم تھا،اس جہت سے دستخط عرض داشت وغیرہ میں دخل تام

---

۱ محل خانہ شاہی ترجمہ پریخانہ فارسی نوشتہ واجد علی شاہ

ہوا۔اوران دونوں فرقہ خاص (ڈوم وخواجہ سرا) کے احکام فوق احکام وزیر اعظم ہونے لگے چنانچہ ان سب کا دماغ فلک ہشتمی سے گذر گیا تھا۔مصاحب الدولہ بہ وجہ اپنی صلاحیت مزاج کے فی الجملہ نیک نام رہے اور پابند صوم وصلوٰۃ بھی تھے‘‘

بعد ضبطی سلطنت جب ۱۸۵۶ء میں سلطان عالم کلکتہ تشریف لے گئے تو انیس الدولہ اور مصاحب الدولہ بھی انکے ہمراہ کلکتہ چلے گئے۔ پھر جب ۱۸۵۷ء میں شاہ معزول فورٹ ولیم (Fort William) نامی قلعہ میں زیر حراست کردیئے گئے تو اسی روز انیس الدولہ بھی اپنے جائے قیام موچی کھولے سے اپنے ولی نعمت کی رفاقت وغمگساری میں قلعہ پہنچ گئے۔انیس الدولہ نے کلکتہ ہی میں رحلت کی اور وہیں سپرد خاک کئے گئے۔انکی پوشاک پنج گوشیہ ٹوپی، انگرکھا اور غرارہ دار پیجامہ تھی۔ متروکہ میں انہوں نے دو لاکھ روپیہ سے زائد کی رقم چھوڑی۔لکھنؤ میں انکا ایک وسیع باغ موسومہ جھانکڑ باغ مفتی گنج کے قریب تھا جسکے وسط میں ایک عالیشان کوٹھی تھی۔ باغ ایک حکیم صاحب کے قبضہ میں ہے مگر کوٹھی منہدم ہو چکی ہے۔

باغ کے علاوہ انکی املاک قیصر باغ کے جانب غرب قریب کچہری کمشنری بھی تھی۔محل سرا اور مسجد دونوں عمارتیں منہدم ہو چکی ہیں مگر امام باڑہ ابتک برقرار ہے اس میں تحصیلی کا دفتر ہے۔تحصیلدار صاحب اور انکے نائبین اسی میں اجلاس بھی کرتے ہیں۔ان ۱؎ جائدادوں کے علاوہ دہلی میں شہزادہ داراشکوہ کا محل بھی تھا جسکو حضرت محمد علی شاہ شہنشاہ دہلی نے نواب برہان الملک سعادت خاں کو برائے قیام عنایت فرمایا تھا۔واجد علی شاہ نے یہ آبائی جائداد بھی جسکی قیمت کا اندازہ پچاس لاکھ روپیہ کیا جاتا ہے انیس الدولہ کو عطا کردی تھی۔

۱۸۸۷ء میں جب واجد علی شاہ اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے تو مصاحب الدولہ بھی لکھنؤ چلے آئے اور یہاں بڑے ٹھاٹھ سے رئیسانہ زندگی بسر کرتے رہے۔ ان کا رنگ گندمی اور قد کسی قدر پست تھا۔خط بنواتے تھے پنج گوشہ ٹوپی، انگرکھا اور غرارہ دار پائجامہ وہ بھی استعمال کرتے تھے فینس یا پالکی گاڑی میں سوار ہوتے تھے۔انکے یہاں گھنٹہ بجتا تھا۔علاوہ کربلا تعمیر کرنے کے انہوں نے اپنے نام پر محلہ مصاحب گنج بھی آباد کیا تھا جس کے چاروں طرف پھاٹک تھے مصاحب گنج میں انکا ایک چوپڑہ کنواں، دومحل سرائیں، ایک باغ اسی مصاحب باغ اور ایک مختصر سی مسجد تھی جو ۱۸۴۹ء/۱۲۶۸ھ میں تعمیر ہوئی اور ابتک موجود ہے۔گوری بہیت فیض اللہ گنج وغیرہ مواضعات اور پار کی مینڈھے والی کوٹھی انہیں کی ملکیت تھی۔۱؎

مصاحب الدولہ نے تخمیناً ۱۸۹۲ء میں انتقال کیا اور اپنی مسجد کے سامنے والی آراضی میں مدفون ہوئے قبر پر ایک مقبرہ تعمیر ہوا تھا جس کے اندرونی جانب آیات قرآنی تحریر ہیں۔مگر یہ مقبرہ بالکل منہدم ہو چکا ہے۔قبر کے اوپر صرف خاک کا ڈھیر پڑا ہوا ہے۔

مصاحب الدولہ لاولد مرے۔ انیس الدولہ کے صرف ایک بیٹے محمد حسین تھے جو بوجہ اسکے کہ بی مشتہری سے پیدا تھے محمد حسین مشتہری والے مشہور ہو گئے تھے۔ دونوں بھائیوں کا متروکہ محمد حسین کو ملا جنہوں نے شروع میں کلکتہ میں رہ کر خوب گلچھرے اڑائے۔آٹھ دس گھوڑے سواری کے لئے رکھے۔ تیس چالیس رفقاء جو مصاحبین روزمرہ انکی دربار داری کرتے تھے۔کلکتہ ہی میں انہوں نے اپنی شادی ایک لڑکی ہاجرہ نامی سے کی جو ایک ہندو بنگالی اٹارنی کے نطفہ سے ایک مسلمان طوائف سے پیدا تھی۔ بروقت نکاح محمد حسین سے انکی کل جائداد لکھنؤ بیوی کے دین مہر میں لکھوالی گئی تھی۔اتفاقاً میاں بیوی میں کسی بات پر ناچاقی ہوگئی اور محمد حسین نے کلکتہ سے لکھنؤ آکر ایک دولہ کی لڑکی سے جو پہلے واجد علی شاہ کے متعہ میں تھی عقد کرلیا یہ خبر سن کر زوجۂ اولیٰ نے زرمہر کا دعویٰ کرکے ڈگری حاصل کرلی جس کے ایفاء میں محمد حسین کی کل جائداد واقع لکھنؤ نیلام ہوگئی اور

۱؎ تواریخ اودھ مولانا نجم الغنی جلد پنجم بحوالہ مخانہ جاوید

موصوف تونگر سے قلندر ہو گئے۔

محمد حسین کو راقم الحروف نے بسلسلہ مقدمہ بازی دیکھا تھا۔ان کا رنگ گندمی، چہرہ طباقی، سر پر پٹے خط بنا ہوا،لبیں کتری ہوئی ، دو پلی ٹوپی ،انگرکھا اور ڈھیلے پائچوں کا پائجامہ پہنتے تھے، جائداد نکل جانے کے بعد محلہ نخاس میں قیام اختیار کیا تھا۔ تخمیناً ۱۹۲۷ء کے پریشانی کے عالم میں پھر کلکتہ چلے گئے اور وہیں انتقال کیا۔ان کی رحلت سے اس خاندان کا آخری چراغ بھی گل ہو گیا۔

(ماخوذ از ماہنامہ الواعظ لکھنؤ مئی ۱۹۴۶ء ص ر ۷ تا ۱۰)



امام باڑہ آغا باقر خان لکھنؤ

یہ قدیم و تاریخی امام باڑہ مڈی مین مارکیٹ (Maddiman Market) یعنی چوک کی ترکاری منڈی کے پہلو میں جانب مشرق واقع ہے جس سے اماباڑہ غفرانمآب صرف چند قدم کے فاصلہ پر ہے۔اس کو آغا اسمٰعیل دلاور جنگ کی خواہش پر ان کے چچا و کارپرداز آغا باقر خاں نے بعہد دولت نواب شجاع الدولہ قریب مسافر خانہ بنوایا تھا۔

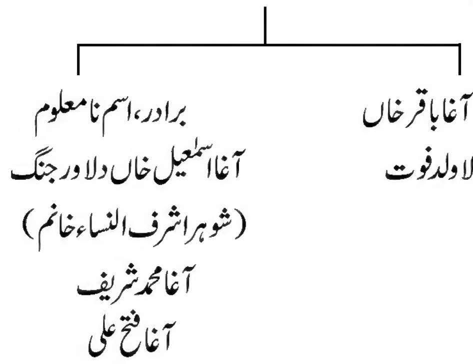
اس [1] وقت تک لکھنؤ میں صرف ایک اماباڑہ آغا ابوطالب خاں کا باغ آئینہ بی متصل حسین گنج میں تھا اس اعتبار سے یہ دوسرا امام باڑہ تھا جو سرزمین لکھنؤ میں تعمیر ہوا۔اس مقام پر پہلے چوڑی والیاں آباد تھیں۔ان کے بہت سے مکانات لے کر مسمار کرا دیے گئے اور ایک وسیع تختہ آراضی پر اماباڑہ کی داغ بیل پڑی ۔آغا باقر خاں نے یہ امام باڑہ نہایت شاندار بنوایا تھا حضرت محمد علی شاہ کا اماباڑہ [2] موسومہ حسین آباد واقع جمنیاں باغ اسی اماباڑہ کا نقش ثانی ہے جس سے

۱۔قیصر التواریخ جلد اول، ص ر ۲۸۴

۲۔قیصر التواریخ جلد اول، ص ر ۳۵۴

اول الذکر اماباڑہ کی وضع قطع کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔

آغا باقر خاں اصفہانی آغا اسمٰعیل خاں دلاور جنگ کے چچا نواب شجاع الدولہ کے عہد دولت میں پانچ ہزار سواروں کے رسالدار تھے عبدالرحمان خاں قندھاری بھی پہلے انھیں کے رسالہ میں تھے جو فریدوں بخت مرزا محمد مہدی عرف مناجان کی جبری تخت نشینی کی ہنگامہ آرائی میں زخمی ہو کر شاہد مرگ سے ہمکنار ہو گئے تھے [1]۔شجرۂ خاندان آغا باقر خاں حسب ذیل ہے:۔



آغا اسمٰعیل کی شادی مرزا حسن علی کی بیٹی اشرف النساخانم سے ہوئی تھی۔مرزا حسن علی کی کثیر املاک فرنگی محل میں تھی۔آغا اسمٰعیل کو نواب شجاع الدولہ نے کالپی کا عامل مقرر کیا تھا کہ یہ صاحب رسالہ میں وہاں کے سرہنگ و سرکش مرہٹے ان کا لوہا مان کر ان کے رعب داب میں آ جائیں گے مگر ان کو موت نے فرصت نہ دی اس کے بعد آغا باقر خاں لکھنؤ سے گئے۔انھوں نے اپنے مختصر قیام کالپی میں ایک اماباڑہ بھی قائم کر دیا۔موصوف کو بھی تبرید میں زہر دے کر موت کے گھاٹ اتارا گیا۔قریب سرائے کالپی دفن ہوئے۔کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔قبر پر ایک مقبرہ بھی تعمیر ہوا۔

آغا اسمٰعیل کے صرف ایک بیٹے آغا محمد شریف تھے۔

(۱) قیصر التواریخ ص ر ۱۳

لڑکپن میں ان کی والدہ خوف کے مارے مکان سے باہر نہیں جانے دیتی تھیں۔ جب تک آغا باقر خاں زندہ رہے انہیں مثل فرزند کے سمجھتے رہے۔ اماباڑہ میں مجلس ایران کے طریقہ پر ہوتی تھی۔ سب مغلئے جمع ہوتے تھے۔ آغا باقر اپنی نمود کے لئے آغا محمد شریف کو بھی اپنے ساتھ مجلس میں لے جاتے تھے۔ جمعہ کے روز اماباڑہ کی نذر و نیاز، اشرف النساء خانم کو جاتی تھی۔ دولتمند اشخاص اماباڑہ سمجھ کر ان میں دفن ہونے لگے۔ آغا محمد شریف نااہل اور شوقین مزاج نکلے۔ فرنگی محل میں ان کی ۲۲ حویلیاں اور ساٹھ دوکانیں تھیں۔ اس کے علاوہ ایک محلسرا اور بارہ دری بھی تھی۔ کل جائداد کا معقول کرایہ آتا تھا۔ جب تک اشرف النساء خانم زندہ رہیں صاحبزادے ان کے مطیع وفرمانبردار رہے۔ آغا باقر نے اشرف النساء سے کہا کہ تم جوان بیوہ ہو اپنا عقد ثانی کرلو مگر انھوں نے منظور نہ کیا۔ بہت توقیر اور نیک بختی سے زندگی بسر کی۔ اپنے مختلف البطن بہن بھائیوں کو بھی خوش رکھا۔ جب دنیا سے سدھار گئیں تو اپنے بھائی مرزا حیدر علی یک چشم کے اماباڑے میں اپنے باپ کے پہلو میں دفن ہوئیں۔ ماں کی آنکھیں بند ہوتے ہی محمد شریف کھل کھلے اپنے نانا کی کل املاک اپنی ماں کے مہر میں بذریعہ عدالت حاصل کر کے باقی کل اولاد کو محروم کر دیا۔ پہلے حویلیاں خال سے لگادیں۔ پھر محل سرا اور بارہ دری مرزا جعفر کے ہاتھ بیچ ڈالی آخر کار مفلس ومحتاج ہوکر مر گئے۔ اماباڑہ آغا باقر میں دفن ہوئے۔ اس کے بعد کل املاک داخل سڑک شارع عام ہوگئی۔ آغا محمد شریف صاحب مقدرت تھے، اس لئے اماباڑہ میں میت دفن کرنے کا کوئی معاوضہ نہ لیتے تھے۔ ان کے بیٹے فتح علی تنگدست و نادار تھے، اس لئے اماباڑہ میں دفن کے لئے بہت کچھ لینے لگے۔ آخر الذکر کے صرف دو بیٹے تھے پھر تو معاوضہ لینے کا راستہ کھل گیا اور بقول مرزا کمال الدین حیدر مصنف قیصر التواریخ اماباڑہ کا احترام رخصت ہونے لگا۔

اماباڑہ ۱۸۵۷ء کی شورش عظیم تک برقرار رہا۔ ۱۸۵۸ء میں جب انگریزوں کا لکھنؤ پر دوبارہ تسلط ہوا تو اماباڑہ آصف الدولہ کو حصن حصین قرار دے کر اس کے چاروں طرف پانچ سو گز تک سب عمارتیں منہدم کر کے میدان کرادیا۔ اماباڑہ نواب حسن رضا خاں ومسجد متعلقہ جس میں ستر اسی برس تک جمعہ و جماعت ہوتی تھی زمین دوز ہوگئی۔ اماباڑہ آغا باقر خاں بھی حصار قلعہ میں آگیا اور کھد کر برابر ہوگیا اس کے بعد مرزا حیدر شکوہ شہزادہ دہلی نے بہ سبب اس کے کہ ان کے باپ مرزا کاظم بخش خلف مرزا سلیمان شکوہ پسر دوئم حضرت شاہ عالم بادشاہ دہلی وہاں دفن تھے انجینئر صاحب کی اجازت سے قطعہ آراضی اماباڑہ لے کر وسط میں ٹین کا بنگلہ ڈلوادیا جس میں ایک خوشنما سورج مکھی بھی لگی تھی۔ جب مرزا حیدر شکوہ کی بیوی طیبہ[۱] بیگم نے انتقال کیا تو وہ بھی اسی اماباڑہ میں سپرد خاک کی گئیں چونکہ کل صحن قبروں سے پر ہو چکا تھا اس لئے وہ حوض کے مقام پر دفن کی گئیں۔

مگر اب کسی قدیم قبر کا نشان تک نہیں پایا جاتا۔ مرزا کاظم بخش کے چھ بیٹے (۲) مرزا حیدر شکوہ، مرزا ہمایوں شکوہ، مرزا امیر الدین، مرزا نور الدین، مرزا زاہد الدین، مرزا نجف تھے۔

۱۸۵۷ء کی شورش کے زمانہ میں مرزا حیدر شکوہ و مرزا ہمایوں شکوہ و دیگراں بوجوہات بیلی گارد میں زیر حراست کردیئے

(۱) یہ نام ہمیں خاندان تیموریہ کے بعض افراد سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کسی تاریخ میں درج نہیں ہے۔

(۲) مصنف قیصر التواریخ نے بیان کیا ہے کہ مرزا کام بخش کے صرف چار بیٹے تھے مگر تیموری خاندان کے بعض اراکین نے راقم السطور سے بیان کیا کہ ان کے چھ بیٹے تھے جن کے نام درج کئے گئے ہیں۔

گئے۔ اسیری سے رہائی پانے کے بعد (۱) دونوں صحیح سلامت گھر آئے۔ ہزار روپیہ مہینہ کی پنشن خزانہ سرکار انگریزی سے جاری ہوئی۔ انہوں نے چھ ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ قدیم جو ان کے جد امجد شہزادہ سلیماں شکوہ سرکار اودھ سے ملتی تھی دعویٰ کیا۔ کاغذات اسناد و خطوط گورنر جنرل بھی پیش کئے۔ آخر ولایت کی نوبت پہنچی۔ اس عرصہ میں مرزا حیدر شکوہ روانہ کربلائے معلیٰ ہوئے مشہد مقدس میں جاکر انتقال کیا۔ اس کے بعد سرکار سے ان کے متعلقین وعیال پر پانچ سو روپیہ ماہوار اضافہ ہوئے۔ اپنے جیتے جی ہزاروں روپے تنخواہ میں سے چھ سو خود لیتے تھے باقی چار سوا اور سب میں تقسیم کر دیتے تھے۔ ان کے دم تک گھر کی رونق برقرار رہی ان کے بڑے بیٹے مرزا احمد علی شاہ ولی عہد کہلاتے تھے۔ ان کے چلن (۲) ٹھیک نہ تھے وہ قرض کے جنجال میں بھی پھنس گئے۔ مکان سکونتی واقع محلہ مفتی گنج جو ٹیکرہ پر مثل کھنڈر کے تھا اور زمین امامباڑہ آغا باقر خاں کلولچند مہاجن کے قبضہ میں چلی گئی یہ بے گھرے ہو کر اپنے خسر نواب سراج الدولہ کے ایک مکان میں رہنے لگے۔

تخمیناً ۱۸۷۲ء میں مہاجن مذکور الصدور نے امامباڑہ کی آراضی اور مکان مسکونہ زر قرض کی ادائی کے لئے نیلام پہ چڑھایا مدیون ڈگری مرزا احمد علی شاہ نے عدالت میں اس مضمون کی عذرداری پیش کی کہ آراضی قبرستان ہے بدیں وجہ قابل بیع و انتقال نہیں ہے۔ عدالت نے ان کی عذرداری قبول کر کے آراضی واگذار کر دی مگر تخمیناً ۱۸۸۲ء میں خود انہیں حضرت نے کچھ آراضی علیٰحدہ کر کے

باقی ماندہ لکھنؤ کی مشہور ومعروف طوائف بی حیدر جان سکنہ گلی پارچہ کے ہاتھ فروخت کر ڈالی۔ حیدر جان نے اپنے تختہ آراضی کا نام اپنے نام پر ''حیدر نگر'' رکھا۔ عوام اس کو ''حیدر جان کا احاطہ'' بھی کہتے تھے۔ اسی احاطہ میں قصائی والے پل کے قریب حیدر جان کا ہاتھی رہتا تھا۔ حیدر جان سے قریب قریب کل آراضی گورنمنٹ نے لے لی۔ اسی آراضی پر موجودہ سبزی منڈی یعنی مڈی مین مارکیٹ (Muddiman market) تعمیر ہوا۔ کچھ حصہ پر میڈیکل کالج کا قبضہ ہو گیا باقی ماندہ ایک نواب صاحب کے قبضہ میں ہے جنہوں نے حیدر جان سے ان کی ضعیف العمری میں نکاح کیا تھا۔

امامباڑہ کو پہلی دفع راجہ شعبان علی خاں صاحب تعلقدار سلیم پور نے بنوایا۔ دوسری بار تخمیناً ۱۸۸۰ء میں راجہ امیر حسن خانصاحب والی محمود آباد نے تعمیر کرایا تیسری مرتبہ اندازاً ۱۹۰۴ء میں بمبئی کے ایک بوہرہ سیٹھ نے بنوایا۔ امامباڑہ کی موجودہ شکل کمرہ کی وضع کی ہے جس کے آگے برآمدہ میں پرنالی دار ٹین کا سائبان ہے اور روکار کی جانب نیز پہلو میں معمولی سا صحن ہے جس کے اردگرد پختہ چہار دیواری ہے۔ اس کے دو درجے ہیں ایک مردانہ اور دوسرا زنانہ، زنانہ درجہ جانب شمال ہے اور مردانہ درجہ اسی سے ملحق جنوب کی سمت ہے۔

اندازاً ۱۹۱۰ء میں مرزا احمد علی شاہ کے بعد ان کے بیٹے مرزا محمد علی شاہ عرف محمد نواب صاحب متولی ہوئے۔ اسی سال انھوں نے لکھنؤ کی ایک طوائف نظیر جان چودھرائن کی قبر احاطہ میں معقول معاوضہ لے کر بنوادی۔ اس واقعہ سے شیعی دنیا میں غم وغصہ کی زبردست لہر پیدا ہو گئی جس کے نتیجے میں غیروں کی قبریں احاطہ امامباڑہ میں بنوانے کا اختیار سلب کر لیا گیا۔ اب صرف تیموری خاندان سے تعلق رکھنے والے اس میں دفن کئے جاسکتے ہیں۔ ۱۹۴۲ء میں محمد نواب صاحب کا بھی انتقال ہو گیا۔ انہوں نے چار فرزند چھوڑے وہی امامباڑہ کے مہتمم ہیں۔

امامباڑہ میں سالہا سال سے خواص وعوام مجالس عزا برپا کرتے ہیں، نذریں چڑھاتے ہیں، ہر شب جمعہ کو مجمع ہوتے

(۱)۔ قیصر التواریخ جلد ۲، ۳۵۵

(۲)۔ قیصر التواریخ جلد ۲، ص ۳۵۹

اور اکثر پنجشنبوں یا ایام عزا میں ماتمی انجمنوں کے علم وہاں جاتے اور وہاں سے اٹھتے ہیں۔ تمام چڑھاووں وغیرہ کے مالک ومختار مجاور ہی ہیں وہی جس طرح مناسب خیال کرتے ہیں ان کو صرف کرتے ہیں۔

سودآ[1] نے بعمر ۷۰ سال ۱۱۹۵ھ میں رحلت کی اور آغا باقر کے امامباڑہ ہی میں دفن ہوئے۔ (تذکرہ گل رعنا از مولوی محمد یحییٰ ندوی) مصحفی نے تاریخ کہی:

سودآ کجاو آں سخن دل فریب او

مرزا سودآ کی قبر بھی اب ناپید ہوگئی ہے۔

میرے مکرم دوست سید شہنشاہ حسین صاحب ایڈوکیٹ اڈیٹر رسالہ خیاباں بھی سودآ کے مزار کے متعلق اپنی تحقیقات کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے کتابچہ ''ہم گور غریباں'' میں تحریر کرتے ہیں۔

''بھلا ہو میرے ایک قدیم دوست کا جنہوں نے بتلایا کہ ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں حضرت مصحفی کے تذکرۃ الشعراء کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے چنانچہ راقم الحروف نے اس نسخہ کو جا کر بچشم خود دیکھا اور اپنا گوہر مراد پالیا۔ خود اس نسخہ میں کہیں بھی مصحفی نے کسی شاعر کی جائے مزار نہیں لکھی ہے۔ یہ اتفاق ہے کہ چونکہ سودآ کے مزار کے متعلق ایک واقعہ یہی ہے لہٰذا صاحب تذکرہ حضرت مصحفی نے اس کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ مصحفی مغفور مرزا سودآ کا تعارف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''کہ درعصر خویش سر آمد شعرائے ریختہ گو گذشتہ بعضے او رادریں فن ملک الشعراء پرستش میکنند۔

سودآ کو جھڑے بالوں دار کتوں اور فن موسیقی کا بھی شوق تھا۔ اس کا بھی ذکر مصحفی نے کیا ہے۔ بعدہٗ تحریر کرتے ہیں کہ محرم میں ایک دوست کے ساتھ آغا باقر کے امامباڑے جانے کا اتفاق ہوا۔ اتفاق سے سودآ کا خیال آ گیا۔ فاتحہ پڑھنے کے لئے قبر پر بیٹھ گئے تو دیکھا کہ لوح مزار پر حسب ذیل قطعہ کندہ ہے:۔

خلد میں جب حضرت سودآ گئے
فکر میں تاریخ کے ماہرؔ ہوا
بولے منصف دور ہو پائے عناد
شاعران ہند آں سرور گیا

یہ قطعہ سودآ کے ہمدم وہمنشیں میر فخرالدین ماہرؔ کا کہا ہوا ہے۔ آخر دونوں مصرعوں سے سنہ وفات کے اعداد نکلتے ہیں۔ قرائن سے تخرجہ معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ اس تاریخ کا نغمہ مصحفی کی رائے میں خلاف قانون مورخاں تھا لہٰذا دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ سودآ ایسے جلیل القدر شاعر کی تاریخ وفات کہنے کے لئے میرا ایسا جلیل القدر تاریخ گو ہونا چاہئے۔ لہٰذا گھر پہونچ کر فوراً حسب ذیل قطعہ نظم فرمایا:۔

مرزا رفیع آن کہ از اشعار ہندیش
ہر گوشۂ بود ہمہ ہندوستاں علو

اس کے بعد کا مصرعہ صفحہ کرم خوردہ ہونے کی وجہ سے نہیں پڑھ سکا جو الفاظ مجھ کو ملے تھے وہ یہ تھے ---۔ چودر نوشت --۔ حیات را۔

آخری مصرع یہ ہے اور اس سے تاریخ نکلتی ہے۔

گردید مدفنش ز قضا خاک لکھنؤ

نام مرزا محمد رفیع سودآ تخلص تھا ان کے والد مرزا محمد شفیع کابل کے باشندے تھے، جو بسلسلۂ تجارت دلّی آئے اور پھر وہیں کے ہو رہے۔ مرزا سودآ دہلی میں ۱۱۲۵ء میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم وتربیت پائی۔ پہلے فارسی میں طبع آزمائی کرتے

---

[1] تذکرہ گل رعنا از مولوی محمد یحییٰ ندوی

تھے پھر خان آرزو کی فہمائش سے اردو میں کہنے لگے اور اس زبان میں وہ بات پیدا کی کہ دلی اور لکھنؤ کے سخن شناسوں سے اپنی استادی تسلیم کرالی۔ دلی میں شاہ عالم بادشاہ اپنا کلام سودا کو دکھاتے تھے۔ جب مرزا کے کلام کا شہرہ لکھنؤ تک پہنچا تو نواب شجاع الدولہ نے کمال اشتیاق سے برادر من مشفق مہربان من لکھ کر بلوایا مگر انہیں دلی چھوڑنا گوارہ نہ ہوا اور معذرت میں یہ رباعی لکھ بھیجی:۔

سودا پئے دنیا تو بہر سو کب تک
آوارہ ازیں کوچہ بہ آں کو کب تک
حاصل یہی اس سے نہ کہ دنیا ہووے
بالفرض ہوایوں بھی تو پھر تو کب تک

آخر کار زمانہ کے نشیب وفراز نے مرزا کو دلی چھوڑنے اور لکھنؤ جانے پر مجبور کیا۔ نواب شجاع الدولہ اور ان کے فرزند ''آصف الدولہ نے ان کی بہت قدردانی کی۔ ستر برس کی عمر میں انہوں نے لکھنؤ میں رحلت کی۔ سودا اردو کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ انہوں نے قریب قریب کل اصناف سخن میں طبع آزمائی کی، خصوصاً شوخیٔ طبع سے ہجو گوئی میں۔ اردو میں قصائد کا کہنا اور پھر انہیں اعلیٰ درجہ کی فصاحت وبلاغت تک پہنچانا ان کا بڑا کارنامہ ہے''۔ شوکت الفاظ، بلند پروازی اور نازکی مضامین سودا کے کلام کی خاصیت ہے۔

ماخوز از ماہنامہ ''الواعظ'' لکھنؤ جنوری ۱۹۴۸ء ص ۲۴۔۱۹



امام باڑہ جنت مآب لکھنؤ (۱)

مرکز علم لکھنؤ کی پرانی آبادی میں حلقۂ چوک مسجد تحسین کے پچھواڑے واقع ہے۔ اس مقام پر اکبری دروازہ کی تعمیر سے پہلے نرکل کا جنگل تھا۔ جب لکھنؤ کی تاسیس ہوئی اور شہر کی آبادی بڑھنے لگی تو چند خدا ترس بندوں نے مسافروں کے ٹھہرنے کو سرائیں بنوائیں، بیچ کی سرا، میوہ والی سرا، بانس کی سرا، اس آراضی کے گردوپیش کے مقامات تھے جہاں پردیسی ٹکتے تھے۔ سلطنت اودھ کے مشہور خواجہ سرا تحسین علی خاں نے نوابی میں اپنے خرچہ سے ایک سرا بنوائی جو کٹرہ تحسین اور سرائے تحسین کے نام سے آج تک موسوم ہے۔ شاہان اودھ کے ملازمین نے بھی اپنے مکانات اسی ماحول میں تعمیر کئے اور اس محلہ کو چوبداری محلہ کہا جانے لگا۔ پرانے کاغذات اور بندوبست سرکاری کے فائل میں یہ نام بھی موجود ہے۔ انقلاب سلطنت اور غدر ۱۸۵۷ء کے بعد سرا کے مکانات رہنے والوں کی ملکیت ہوگئے اور اصل مالک کا پتہ نہ رہا، قوم شیعہ کے مشہور مجتہد سید محمد تقی جنت مآب مرحوم نے اس محلہ کو اپنے قیام کے لئے تجویز کیا اور بھٹیاروں سے آراضی خرید کر امام باڑے کی تعمیر کا ارادہ کیا۔ یہ مقام لکھنؤ کی شیعی آبادی کے بیچ میں واقع ہے اور ہر طرف کے مومنین کو یہاں پہونچنے میں سہولت دیکھ کر جناب مرحوم نے ۱۷ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ مطابق ۸ جولائی ۱۸۶۸ء کو امام باڑہ کا سنگ بنیاد نصب کردیا۔ اس برکت آفریں تاریخ سے ابتداء ہوئی اور آخر ذی قعدہ ۱۲۸۷ھ مطابق فروری ۱۸۷۱ء میں امام باڑہ بن کر تیار ہوا۔ جنت مآب علیہ الرحمہ کو شاہ اودھ کی طرف سے ممتاز العلماء فخر المدرسین کا خطاب حاصل تھا اور قوم شیعہ ان کو اپنا زبردست رہنما سمجھتی تھی۔ امام باڑہ کا تمام عمارتی سامان ازقسم چوب خشت پاک کرکے مسلمان کاریگروں کے ہاتھ سے استعمال ہوا جس وقت امام باڑہ کا اساس قائم ہوا اور دروں کی وسعت پر لکھنؤ کے امیر کبیر ناظم آغا علی خاں مرحوم کی نظر پڑی تو طنزیہ کہا کہ قبلہ وکعبہ فیل خانہ بنوا رہے ہیں۔ مقدس بانی کے خلوص کا یہ نتیجہ تھا کہ امام باڑہ کا کام ختم ہوتے ہوتے ناظم صاحب کو بھی حسینیہ سے شغف پیدا ہوا اور امام باڑہ چھتوں کی بلندی درجوں کی وسعت

سے اسقدر ہوا دار ثابت ہوا کہ موسم گرما کی سختیوں میں ٹھیک دو پہر کو بھی مجلس ہو تو حاضرین کو گرمی سے تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔ اس وقت امام باڑہ کے صرف دو درجے تھے جن کی وسعت اور کشادگی دیکھتے ہوئے امام باڑہ آصف الدولہ کے بعد کوئی دوسرا امام باڑہ نظر نہیں آتا منبر کا درجہ اس قدر وسیع ہے کہ سوائے ۹ر محرم کی عظیم الشان مجلس کے کسی موقع پر مومنین سے بھر نہیں سکتا۔ پہلوؤں کی صحنچیاں دو منزلہ ہیں جن میں بالائی حصہ پر خواتین اور پردہ دار عورتیں شریک مجلس ہو سکتی ہیں۔ راستہ پشت کی طرف سے واقع ہے۔ جنوبی حصہ میں ضریح مبارک کا گنبد ہے جو مسجد کی محراب میں امام جماعت کے کھڑے ہونے کی جگہ سے اشبہ ہے۔ کرسی شہ نشین کی تا بہ زانو بلند ہے، امام باڑہ کی تعمیر ہی کے زمانہ میں ایک تاجر عراق سے ضریح خاک شفا لے کر ہندوستان آیا اور لکھنؤ کا کوئی رئیس اس کے حسب دلخواہ قیمت نہ دے سکا تو اس نے ضریح مبارک امام باڑہ نو تعمیر میں چڑھا دی جو آج تک موجود ہے اور غالباً شیعی دنیا کے کسی گوشہ میں خاک شفا کی ضریح نہیں ہے۔ ضریح کے پہلو میں اور اس کے محاذ میں دو دو برنجی علم نصب ہیں جن کے پٹکے چھپے ہوئے ہیں۔ امام باڑے کی وسعت اور بزرگی میں ایک راز یہ تھا کہ جنت مآب کی دور س نگاہوں نے فیصلہ کیا کہ امام باڑہ اس قدر وسیع ہو جو تحسین علی خاں کی عظیم الشان مسجد کے روبرو عمارتی لحاظ سے ناموزوں نہ ہو اور جس قدر سر بلند مسجد ہے اسی قدر پرشوکت امام باڑہ بھی ہوتا کہ نماز وہاں ہو اور مجلس یہاں امام باڑہ کی وسعت کو دیکھتے ہوئے صحن بھی اسی قدر وسیع قرار دیا اور عہد ممتاز العلماء میں پورا احاطہ بکار مجلس استعمال میں تھا۔ روکار پر میزاب کے قریب پتھر نصب ہے جس پر تاریخ کندہ ہے جو افسوس ہے کہ پڑھی نہیں جاتی۔ تعمیر کو اسی سال گذرے ہیں روکار میں پانچ در ہیں جن میں چوبی دروازوں کے بجائے سرتا سر پٹرے لگے ہوئے ہیں جو آسانی سے مجلس کے وقت نکال لئے جاتے ہیں ممبر نقشیں چوبی ہے جس پر سبز شامیانہ لگا رہتا ہے۔

دیوان لطافتؔ میں امام باڑہ کی تاریخ حسب ذیل موجود ہے۔

قبلہ و کعبہ اعلم و اکمل
عادل و متقی و راہنما
مجتہد جامع الشرائط ہیں
زاہد و عابد و مطیع خدا
علماء میں بہت ہیں یہ ممتاز
جگر و جان سید العلماء
ہے جو ان کا امام باڑہ رفیع
خوب و مرغوب و تحفہ و زیبا
اس مکان شریف و اقدس کی
جب ہوئی اس جگہ شروع بناء
کہہ دیا ۱۲۸۵ھ تعزیت سرائے حسین
بس لطافتؔ نے سال ہجری کا
بن چکا جب تمام اور کمال
ہوگئی مجلس عزا ء برپا
کی رقم دل نے دوسری تاریخ
تعزیہ خانۂ حسین ہوا

(ریاض لطافت، ص ۳۶۶)

۱۲۸۷ھ

مجلس

جناب ممتاز العلماء نے اس امامباڑہ کے شمالی حصہ میں جو مکان اپنے رہنے کے لئے تعمیر کیا تھا مجلس کی بنیاد اسی مکان میں کی تھی جس میں مولانا امداد علی صاحب کیرانوی ملتان کے محدث آخری ذاکر تھے اور مکان ناکافی ہوتا تھا امام باڑہ بن کر

تیار ہونے پر صرف دو سال مجلسیں کر سکے۔اور پھر موت نے اسی امامباڑے میں روز قیامت تک کے لئے محوِ خواب کر دیا۔یہ مجلسیں اس قدر خلوص اور نیک نیتی سے قائم کی گئیں تھیں کہ لکھنؤ کی تمام شیعہ آبادی ہر امیر وغریب بفخر شریک ہوتا تھا اور وہ روساء جو کبھی گھر سے نہ نکلتے تھے اپنے راحت وآرام کو چھوڑ کر علی الصباح وقت سے پہلے آجاتے تھے۔روساء و شاہزادگان میں شہزادہ مرزا خرم بخت بہادر خلف اکبر حضرت فردوس منزل محمد علی شاہ بادشاہ اودھ،نواب مرزا والا قدر کیواں جاہ،محسن الدولہ منتظم الملک محسن علی خاں بہادر غضنفر جنگ،ممتاز الدولہ مدبر الملک حسین علی خاں تہور جنگ بہادر،نواب معین الدولہ مرزا امام علی خاں بہادر،شاہزادہ مرزا رفیع الشان بہادر، شاہزادہ مرزا عظیم الشان بہادر صاحب عالم مرزا مصطفی علی خاں بہادر،مرزا حیدر شکوہ بہادر شاہزادہ سلطان مرزا دارا سطوت مرزا محمد رضا علی بہادر مرزا محمد تقی خاں فیل جنگ،نواب سعید الدولہ، بہادر نواب شرف الدولہ بہادر نواب اشرف الدولہ بہادر نواب مرزا عالی جاہ بہادر نواب مرزا والا جاہ بہادر نواب حسین علی خاں خلف نواب فارس الدولہ بہادر نواب مرزا علی خاں خلف نواب قاسم علی خاں قائم جنگ،مرزا علی مہدی خاں ابن زین العابدین خاں عرف مرزا مینڈو صاحب اور کتنے رؤسا وعمائد سر برہنہ مجلس میں شریک ہوتے تھے۔رؤسا و شاہزادگان کی صفیں صدر مجلس میں منبر کے سامنے ہی سے شروع ہوتی تھیں اور گریہ میں قبلہ وکعبہ کی آواز بلند ہونے پر کہرام برپا ہوتا تھا۔نویں کی مجلس میں سحر کے وقت سے مجمع ہونا شروع ہوتا تھا۔رؤسا کے قالین تڑکے سے بچھ جاتے تھے جن پر مصاحب آنے والے رئیس کے انتظار میں بیٹھتے تھے اور یہ وضع کی پابندی سمجھی جاتی تھی کہ جو ایک جگہ بیٹھ جاتا تھا وہ ہمیشہ اسی جگہ بیٹھتا تھا اور دوسرے کو وہاں بیٹھنے کا حق نہ تھا لوگ خود اس جذبہ کا احترام کرتے تھے۔

نویں مجلس تاریخی حیثیت رکھتی ہے اور شیعہ مؤلفین نے اپنی کتابوں میں اس مجلس کا ذکر کیا ہے ملاحظہ ہو تنزیہہ الھفوات (مولفہ نوازش حسین خاں الہ آبادی ص ۴۳ مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۰۲ء وتذکرہ بے بہا،ص ۳۸۵ مطبوعہ دہلی) جناب علامہ مفتی میر عباس صاحب مجتہد المتوفی ۱۳۰۶ھ نے ممتاز العلماء کے مرثیہ میں اس مجلس کی طرف اپنے اس شعر میں روشنی ڈالی ہے۔

در ایام ماہ محرم ازو

عجب مجلسے در عزائے امام

ممتاز العلماء کی زندگی میں اس امام باڑے میں پرانے طرز کی ذاکری ہوا کرتی تھی اور کئی کئی ذاکر یکے بعد دیگرے پڑھتے تھے زندگی کے آخری دور میں ابتدائی ذاکر مولانا مرزا رضا علی صاحب مرحوم منطقی اور آخری ذاکر مولانا میر سید علی صاحب مرحوم یا میر محمد شاہ صاحب المتوفی ۱۳۰۵ھ تھے۔

۞ قوم میں امام باڑہ کی ضرورت

عموماً امام باڑہ حضرت سید الشہداء روحی فداہ کی طرف منسوب ہونے سے قابل احترام سمجھا جاتا ہے لیکن اگر ہم سے پوچھا جائے کہ امام باڑہ بنانے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی اور اس میں روپیہ صرف کرنے کو سنی بدعت کہتے ہیں تو کیا جواب ہے؟ ہم اس مضمون کو علمی شان سے پیش کر رہے ہیں اس لئے ہم کو یہ بھی حق ہے کہ موجودہ زمانہ کے تنگ نظر مسلمانوں کے شبہات کا جواب عرض کرتے رہیں۔اس ضرورت کا احساس حضرت یعقوبؑ نبی صلعم کی طرف سے ہوا۔ اگر گریہ وبکاء کے لئے آپ ایک خاص عمارت قرار نہ دیتے تو بیشک ہم کو بھی حق نہ تھا کہ قصر عزاء قائم کریں۔یعقوبؑ نے بیت الحزن بنوایا جس کا تذکرہ ہر زبان پر ہے،لغت تک میں

یہ چیزیں موجود ہیں۔

مفتی غلام سرور اپنے لغت میں لکھتے ہیں بیت الاحزان یعقوبؑ کے حجرہ کا نام ہے جس میں وہ حضرت یوسفؑ کے فراق میں بیٹھ کر سالہا سال روتے رہے۔

(حافظ) یوسف گم گشتہ باز آید بکنعاں غم مخور

بیت احزانت شود روزے گلستاں غم مخور

(ص ۲۴۰، جامع اللغات، مطبوعہ نولکشور)

یعقوب نے نوحہ وشیون کے لئے علٰحدہ عمارت بنائی تو ہم کو بھی حق پیدا ہوا کہ یوسفؑ کربلا کے غم میں امام باڑہ بنائیں عاشور خانہ قائم کریں، کربلا تعمیر کریں، ایک نبی کی پیروی ہر مومن کا فرض ہے لیکن ہماری دلیل میں زور اس وقت پیدا ہوا جب حضرت امیر خیبر گیر نے جناب سیدہؑ کے لئے بیت الحزن بنوادیا۔ اس عمارت کا موجودہ غیر شیعہ تاریخوں میں بھی ذکر ہے۔ ابراہیم رفعت پاشا ابن سویفی بن عبدالجواد بن مصطفٰی کا بیان ہے:۔

وهنا لک قبة تسمیٰ قبة الحزن يقال انها فی البيت الذی ادت اليه فاطمة بنت النبی والتزمت الحزن فيه بعد وفات ابيها رسول الله صلی الله عليه وآله وسلم

(مرأة الحرمین، ص ۴۲۶، جلد اول)

بقیع میں ایک قبہ گنبد حزن نام کا بھی ہے کہا جاتا ہے کہ یہ وہ گھر ہے جہاں فاطمہ دختر نبیؐ آکر رویا کرتی تھیں۔ اپنے باپ کی وفات کے بعد۔ ''خاتون محشر سیدہ عالم کا عمل اور حضرت علیؑ مرتضٰی روحی فداہ کی تحریک یقیناً ایک سبق ہے جس سے امام باڑہ بنانے کا درس حاصل ہو رہا ہے۔

مزار علماء

ہمارے امام باڑوں میں بیشتر عمارتیں اس مقصد کو بھی پورا کرتی ہیں کہ وہ علماء اور ارباب کمال کی آخری آرام گاہ ہیں اس خصوصیت کے بعد امام باڑہ کی مذہبی حیثیت اور بڑھ جاتی ہے اور وہ ''علماء کا مزار'' بھی ہے جہاں مومنین کو زیارت قبور کے لئے جانا ضروری ہے اہل علم آگاہ ہیں کہ احادیث سے ثابت ہے کہ والدین کی قبر پر اولاد کی دعائیں قبول ہوتی ہیں ارسطو کے شاگرد جب کسی علمی مسئلہ میں الجھتے تھے تو استاد کی قبر پر جا کر ذہن از خود راہنمائی کرتا تھا۔ (اورادالمومنین جلد سوم، ص ۶)

اسلامی نقطۂ نظر سے بھی احادیث نبوی میں یہ مطلب موجود ہے کہ **من اغبرت قدماه فی طلب العلم ينور علی جيرانه اربعين قبراً عن يمينه واربعين عن شماله واربعين عن خلفه واربعين امامه** (تفسیر مفاتیح الغیب، ص ۴۰۵، جلد اول)

جس کے قدم تحصیل علم میں گرد آلود رہ چکے ہوں وہ مرنے کے بعد اپنے داہنے طرف کی ۴۰ قبروں اور بائیں طرف کی ۴۰ قبور اور سرہانے اور پائیں پا کی ۴۰، ۴۰ قبروں کو نور سے جگمگا دے گا۔ پیرا ممتاز العلماء کے امام باڑہ میں مزار علماء ہونے کے لحاظ سے بڑے بڑے امراء رؤسا کو آرزو تھی کہ ایک قبر کی جگہ مل جائے اور قوم یہ سمجھتی تھی:۔

اگر فردوس برروئے زمین است

ہمیں است وہمیں است وہمیں است

لیکن متولیان نے امام باڑہ غفرانمآب کی طرح عام قبرستان نہیں بنایا صرف چندا کابر قوم کو جگہ دی جن کے نام عنقریب آتے ہیں۔

(۱) وسطی درجہ کی غربی صحنچی میں ممتاز العلماء کا مزار مبارک ہے جس پر چوبی خطیرہ نصب ہے۔ امام باڑہ کی تعمیر کے پہلے ممتاز العلماء نے وصیت کی تھی کہ ان کو جناب غفرانمآب کے پائیں پا اور پہلوئے علیین مکان میں دفن کیا جائے ان کی وصیت کے الفاظ یہ ہیں۔

ان مت فی بلدی هذا فادفنی فی جنب والدی العلامه اعلی الله فی دار الكرامه مقامه عند رجلی جدی العلامه المبرور قدس الله

روحه عسی ان یرحم الرحیم الکریم علی برکة
جوارهما ولکن لا تدری نفس بأی ارض تموت
(ارشاد المبتدین کتاب الطہارۃ، ص ۱۱۸)

یہ وصیت ۱۲۷۳ء میں امام باڑہ کی بناء سے ۱۳ سال پہلے کی تھی امام باڑہ کی تعمیر کے بعد بھی جناب اسی خیال پر قائم تھے۔ مرض الموت میں باوجود مرض کی سختی اور شدت کے اپنے تعمیر کردہ امام باڑہ میں دفن ہونے پر استخارہ کیا اور مشیت ایزدی نے پہلی رائے کو تبدیل کر دیا اور تیمارداروں کو حکم دیا کہ قبر اپنے ہی امام باڑہ میں بنے، ۲۴ ماہ رمضان ۱۲۸۹ھ مطابق ۲۶ نومبر ۱۸۷۲ء کو انہوں نے رحلت کی لوح مزار پر کندہ ہے اس کا سرنامہ آیۂ "تلک الجنة التی نورث من عبادنا من کان تقیا" ہے اور لکھنؤ کے باکمال شاعر مولانا سید نجم الدین علی یعنی حضرت کامل المتوفی ۱۳۲۲ھ کی تاریخ ہے۔

از بسیط ارض تاسقف فلک
تیره شد درچشم اخیار و عدول
دامن جاں برگرفت از روزگار
قبلۂ دیں فخر اعلام فحول
حجة الاسلام مولانا التقی
آسمان فقه وتفسیر واصول
رہنمائے جادۂ باب العلوم
مقتدائے شیعه زوج البتول
کرد احیایِ شب قدر و رساند
فرق طاعت را بافلاک قبول
چند ساعت خفته بربالین کرب
اخر شب کرده در جنت حلو ل
گفت کامل سال ایں زرء عظیم
بے ستون شد کعبۂ دین رسول

یہ قطعہ اصل میں ۱۷ شعروں کا ہے دس شعر گنجائش نہ ہونے سے ترک کر دیئے ہیں پورا قطعہ بیاض مراثی پر کتبخانہ میں موجود ہے۔

(۲) پائیں پا جناب ممتاز العلماء کے خلف اکبر وجانشین جناب شمس العلماء سید محمد ابراہیم صاحب مجتہد کا مزار ہے جنہوں نے ۲۰ جمادی الاول ۱۳۰۷ھ مطابق ۱۲ جنوی ۱۸۹۰ء کو انتقال کیا۔ سنگ مزار پر کامل ہی مرحوم کی تاریخ ثبت ہے یہ پتھر ۵۴ روپیہ کا قیمتی ۱۸/رجب ۱۳۰۷ھ کو خرید کر نصب کیا گیا اس قبر پر بھی چوبی خطیرہ بنا ہوا ہے اور یہ تاریخ کندہ ہے:۔

بست رخت زندگی از خلق ہمنام خلیل
برزمیں گوئی یکایک قبۂ خضرا فتاد
آسمان شرع شد بے آفتاب از رحلتش
انقلاب تازه اندر عالم بالا فتاد
شدرواں سیلاب اشک از چشم سکان فلک
قدسیاں را رعشه خورشید در اعضا فتاد
انتقاش سوخت موجودات را در شش جہت
آتش اندر خرمن دنیا و مافیہا فتاد
شام بستم بود از ماه جمادی نخست
یک بیک از ارتحالش درجہاں غوغا فتاد
او نرفت از خلق شد اسلام بے پشت و پناه
تاج نورانی زملت بیضا فتاد
روز مرگش از زمیں شد نالہا چنداں بلند
آه و افغان خلق را برطارم اعلی فتاد
بوستان اصل و فرع فقه شد بے آب و رنگ
برگ سبزے در بہشت علم زطوبیٰ فتاد
گفت کامل از برائے سال فوت آنجناب
کعبه دیں راچه رکنے قائم از پا فتاد

(۳) پشت امام باڑہ پر جو مثلث قطعہ آراضی ہے اس میں مولانا میر حیدر علی صاحب مجتہد (جو بانی امام باڑہ کے تلامذہ

اور جناب مفتی صاحب قبلہ مرحوم کے معاصرین میں تھے) کی قبر ہے ان بزرگ کے عربی مکاتیب ادب کی مشہور کتاب کو اکب دریہ میں موجود ہیں۔ممتاز العلماء نے مدرسہ ایمانیہ لکھنؤ کا مدرس قرار دیا تھا مرحوم کے خاندان میں مولانا سید جعفر حسین صاحب مرحوم معلم دینیات شیعہ کالج تھے جن کا چند سال ہوئے انتقال ہوا ہے۔

(۴) مولانا سید محمد حسین صاحب قبلہ مجتہد مرحوم آپ کی قبر بھی اسی زمین پر ہے جناب مفتی صاحب قبلہ نے یہ تاریخ نظم کی۔

قدمات فی ذی الحجه اهل الحجی
حبر خبیر من له خلق عظیم
ارخت عام وفاته متوجعا
أه ترحل مکرم برعلیم
۱۲۹۶ھ

جناب سید العلماء علیین مکان سے تلمذ تھا۔آپ کا ایک اجازہ مولانا سید نثار حسین صاحب عظیم آبادی کی کتاب الاجازات مطبوعہ ۱۳۱۱ھ میں ہم نے دیکھا ہے۔

(۵) مولانا میر باقر حسین صاحب مرحوم، آپ مولانا مرحوم کے چشم و چراغ اور فقیہ تھے فاضل عظیم آبادی مذکور الصدر کی کتاب مرقومۂ بالا میں آپ کا دیا ہوا ایک اجازہ بھی موجود ہے جناب ممتاز العلماء کی طرف سے مسائل دستخط کرنے کا عہدہ تفویض تھا مرحوم کے فرزند حکیم میر حیدر حسین صاحب مرحوم بڑے مقدس شخص تھے گوالٹولی کانپور میں مطب کرتے تھے ان کے صاحبزادے مولوی میرامیر حسین صاحب مرحوم وقف عمدہ بیگم صاحبہ بھاگلپور میں پیش نماز تھے چار پشت تک سلسلہ علم اس گھرانے میں باقی رہا۔

(۶) جناب مولانا سید جعفر صاحب قبلہ مرحوم پسر جناب سید ابوالحسن عرف ابو صاحب قبلہ مجتہد المتوفی ۱۳۱۳ھ آپ جناب باقر العلوم طاب ثراہ کے بڑے بھائی تھے زیور علم وکمال سے آراستہ تھے وسطی درجہ وقف خاص میں قبر ہے۔

(۷) فقیہ زمن مولانا سید ابوالحسن صاحب قبلہ مجتہد پرنسپل مدرستہ الواعظین، آپ کی قبر صحن امام باڑہ کے مغربی حصہ مسجد خورد سے قریب واقع ہے۔

۞ امام باڑہ کی تولیت

(۱) جناب ممتاز العلماء کے بعد امام باڑہ کے متولی ان کے خلف اکبر جناب سید محمد ابراہیم صاحب قبلہ مجتہد فردوس مکاں قرار پائے جنہوں نے مجالس کو فروغ دینے میں کامیاب حصہ لیا۔مومنین کی کثرت اور زائرین کے اژدھام میں تیسرے درجہ کا اضافہ کیا۔نویں کی مجلس میں بیرونجات کے مخلصین کو مخصوص دعوت نامہ بھیج کر مدعو کرنا، حکام ضلع اور بڑے بڑے یورپین افسران کی شرکت آپ ہی کے دور میں ہوئی۔محرم ۱۳۰۲ھ میں حضور پرنور شاہزادہ مرزا محمد سلیماں قدر بہادر نے نویں محرم کی مجلس کا فوٹو لیا اور دو تصویریں ایک کارڈ سائز پر ایک فل سائز سے کسی قدر بڑی تیار کرنے کا حکم دیا۔نواب بہادر حسین خاں انجم (جو ایک بلند پایہ شاعر اور اعلیٰ مصور تھے) نے فوٹو لیا اور تصویر پر حسب ذیل اشعار خود نظم کر کے تحریر کئے:۔

حسب ارشاد جناب وارث تاج و سریر
صاحب عالم سلیماں قدر شیدائے امام
ایں شبیہ مجلس سبط رسول انجمؔ کشید
تا بمانند اہل دیں صرف زیارت صبح و شام
از محرم بود تاریخ نہم مثل دہم
در سحر معراج منبر ذکر شاہ تشنہ کام
در مکان سید ابراہیم صاحب مجتہد
بود ایں بزم عزا برائے خاص وعام
کن سرا عداجد ا بہرسال آں بگو
انفس ومقبول بزم ماتم شاہ انام
۱۳۰۲ھ

ان مجالس کا یہ اقتدار قائم تھا کہ جناب فردوس مکاں کے دور تک لکھنؤ میں جب تک امام باڑہ کی مجلس ختم نہ ہوتی کہیں مجلسیں نہیں ہو سکتی تھیں۔

(۲) جناب فردوس مکاں کے انتقال کے بعد ان کے خلف اکبر جناب مولانا سید محمد تقی صاحب قبلہ متولی قرار پائے اور ۳۲ سال تک نہایت شاندار فرائض انجام دیے اور مجالس کے وقار کو قائم رکھا۔ رجب ۱۳۲۱ھ کی ہتھیا کی بارش سے امام باڑہ کا وہ درجہ جو جناب فردوس مکاں نے تعمیر کرایا تھا مخدوش ہو گیا، جناب نے اپنے اثرات سے نواب مرزا محمد عباس علی خاں صاحب بہادر مرحوم سے تحریک کی اور از سر نو اس درجہ کو تعمیر کر دیا۔ آپ نے اپنے دور میں مومنین کی کثرت سے امام باڑہ کے چبوترے کو بڑھا کر ان حدوں تک پہونچا دیا جو حدود کہ اس وقت قائم ہیں نیز ماہ صیام میں شبوں کی عزاداری کا بھی اضافہ کیا، امام باڑہ کا تمام فرش نیا بنوایا۔ عہد ممتاز العلماء کے طویل فولادی علم جا بجا سے شکستہ ہو گئے تھے ان کو تبدیل کر کے نئے علم بنوائے۔ جناب کی ذاتی وجاہت اور حسن انتظام سے احاطہ امام باڑہ کی کوئی آراضی اغیار کے تصرف میں نہیں آئی۔ نویں محرم کی مجلس اسی پیمانہ پر منعقد ہوتی رہی۔ رکن العزاء میر نواب علی صاحب مرحوم اس امام باڑہ کے پرانے خادم تھے۔ موصوف اور سید محمد اصغر صاحب مرحوم ایک مرد ضعیف اپنی خمیدہ کمر پر پانی کی مٹکیاں رکھ کر سیکڑوں کی تعداد میں پہونچاتے تھے اودھ اخبار نے ۱۳۲۶ھ کی اشاعت میں اس مجمع کا جو اندازہ کیا ہے وہ حسب ذیل آرٹیکل سے ہوتا ہے:۔

''۹ محرم کی مجلس یادگار زمانہ جناب جنت مآب اعلی اللہ مقامہ کے امام باڑہ چوک میں ہر سال سے بڑھ کر رہی دس ہزار کے قریب مجمع تھا۔ بکاء بھی خوب ہوئی سامان عزا بھی خوب جمع تھا۔ صبح سے شروع ہو کر ۱۲ بجے ختم ہوئی۔ بحیثیت ذاکری جناب غفرانمآب اعلی اللہ درجاتہٗ کے حسینیہ میں سب ہی مجلسیں اچھی ہوئیں بحیثیت ریاست و انتظام بست و نہم ذی الحجہ سے سیہ پوش والی مجلس شروع کر کے نہم محرم الحرام کی حیدر نگر والے میدان کی بڑی مجلس تک جو انتظام نشست و خاطر داری اہل عزا و ترتیب مجلس و ہر امر ضروری جیسا چاہئے تھا جناب مولوی سید مہدی حسین خاں بہادر ماہر کے یہاں ہوئیں دنیا میں کون کر سکتا ہے! دونوں صاحبزادے بنفس نفیس خود ہر ایک سے معافی عدم خاطر داری کے طالب تھے اور اس کشادہ پیشانی اور کسر نفسی سے ہر ایک سے پیش آتے تھے کہ دل شگفتہ ہوئے جاتے تھے کہنے کی بات ہے کہ مجلس کے لئے پنڈال پانچ سو روپیہ میں تیار کرائی گئی آخری مجلس کا مجمع پانچ ہزار سے کم نہ تھا۔

''(اودھ اخبار محرم ۱۳۲۶ھ)

(ماخوذ از ماہنامہ الواعظ لکھنؤ شعبان ۱۳۶۵ھ/ جولائی ۱۹۴۶ء ص/ ۳۳ تا ۴۰/)



آخری متولی کے دور حیات میں اس امام باڑہ کے وقار کو ختم کر دینے کے لئے ۳۰ سال تک مختلف طاقتیں اٹھتی رہیں اور ہر شخص عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتا تھا مگر کسی کو کامیابی نہ ہوئی اس وقت ترکش کا آخری تیر گورنمنٹ کو مدعی قرار دیکر دفعہ ۹۲ کی کمان سے پھینکا گیا جس نے خطا نہ کی اور ۲۸/ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو یہ امام باڑہ چند قانون داں اصحاب کمیٹی کے سپرد ہوا، مولانا سید محمد تقی صاحب قبلہ مجتہد مرحوم میں اب بھی محبت باقی تھی کہ اپنی جان و مال سے مدافعت کریں مگر جو طاقت مقابل ہوئی تھی اس کی سی سالہ کوشش نے تمام ذاتی منقولہ اور غیر منقولہ جائداد کو تلف کر دیا تھا اور سرمایہ کی آخری خشت بھی باقی نہ تھی ساری قوم پر اس فیصلہ کا اثر ہوا اور امام باڑہ کی مجلسیں بند ہو گئیں۔ ایک سال آپ نے عشرۂ محرم کے موقع پر لکھنؤ سے ہجرت کی۔ دوسرے سال اپنے شریعت کدہ ہی پر تھے اور دل و دماغ سے صبر و شکیب کا وعدہ کیا تھا۔ یہ وہ وقت تھا کہ آپ کے سرمائے میں بجز نقد جان اور کچھ نہ تھا۔ عشرہ محرم شروع ہوا تحمل کیا تاریخیں گذریں دل و دماغ پر اثر پڑا از بان سے اف نہ کی

۳ محرم نصف شب کو بستر سے اٹھ کر امام باڑہ کی طرف نگاہ کی مجلسیں حسینی بارگاہ کی ویرانی اور جو مجلسیں تین پشت سے ناغہ نہ ہوئی تھیں ان کو بند دیکھ کر آہ سرد بھری اور گر پڑے جسم سرد ہوگیا ۲۴ گھنٹہ کے بعد ۵ محرم ۱۳۴۱ھ کو دنیا چھوڑ دی آزاد خیال شعراء اصلیت پر پردہ کیوں کر ڈالتے ہر قطعہ تاریخ میں ذاتی مصائب کا ذکر آیا مولانا مفتی سید محمد علی صاحب قبلہ مجتہد العصر پرنسپل عربی شیعہ کالج نے یہ مادہ تاریخ نظم کیا۔

دردا کہ رفتہ سوئے جناں کشتۂ محن

ایک اور تاریخ میں یہ اشعار بھی رہتی دنیا تک پڑھے جائیں گے۔

ظلم اعدا کار او کردہ تمام
پس شہید رنج و غم او را بگو
شد برائے تیر ہائے غم ہدف
آہ و واویلا و واویلا بگو

سید الشعراء ظفرؔ صاحب لکھنوی نے یہ مصرع نظم کیا۔

جان لی ہاں غم نے ان کی آج آہ

۞ مجالس کا انجام

اس وقت امام باڑہ اسی کمیٹی کے قبضہ میں ہے اور آمدنی نہ ہونے سے قبور مجتہدین سے صدا آتی ہے۔

بر مزار ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پر پروانہ آید نے صدائے بلبلے

کمیٹی کے بعد شیعوں میں دو گروہ ہوگئے بعض اس خیال پر قائم ہیں کہ جب تک شخصی اختیارات نہ ہوں مجالس میں نہ جانا چاہئے۔

خوش قسمتی سے یہ وہ زمانہ نہیں تھا کہ لکھنؤ اکابر علمائے کرام سے خالی ہو۔ وہ حضرات موجود تھے جو بذات خود ہر فتنہ کو دبا سکتے تھے اور قوم ان کا وقار مانتی تھی۔ سرکار ناصر الملت اور حضرت باقر العلوم اور قدوۃ العلماء و نجم العلماء طاب ثراہم نے صرف مجالس کی بقاء کے لئے جناب مرحوم کی اولاد کو اجازت دی کہ وہ اس کمیٹی کی شرکت منظور کرے اور اس امام باڑہ کی وہ شہرۂ آفاق عزاداری قائم رہے جس پر لکھنؤ کیا پوری قوم کو فخر تھا۔ بمشورہ مجتہدین طے پایا کہ جناب سلطان الواعظین مولانا سید سبط حسن صاحب قبلہ ان قدیم مجالس میں پڑھیں اور مجالس اپنی روایتی عظمت پر قائم رہیں۔

جناب مولانا سید محمد ہادی صاحب قبلہ وائس پرنسپل جامعہ سلطانیہ نے جو واقف کے نواسے تھے جناب مولانا سید سبط حسن صاحب قبلہ طاب ثراہ کو یہ خط لکھا۔

"دام فضلکم وزاد نبلکم بعدسلام باکرام واحترام ملتمس آنکہ چوں بناء مجالس حسینیہ جد مرحوم طاب ثراہ گویا برہم شدہ اگر بنظر ثواب زحمت گوارہ فرمودہ اقلاً دریک و دو مجلس زینت دہ منبر بشوند احیاء ایں حسینیہ و تجدید ایں مجالس بے من وبرکت جناب سامی می شود واجرا ایں امر خیر کہ ابد اشائبہ ضرر مزار و بدست گرامی باشد البتہ باعث کمال امتنان خواہد بود والسلام۔ محمد ہادی الرضوی بقلمہٖ

باسمہٖ سبحانہ

ایں مقصود محمود یقینا خیلے مناسب وقرین مصلحت می باشد امید انست کہ جناب والا ضرور آں را قبول فرمودہ در اقامت شعائر حقہ مساعدت خواہند فرمود۔ واللہ یضاعف لکم الاجر الجزیل۔

ناصر حسین الموسوی عفی عنہ

باسمہٖ سبحانہ

تجویز مذکور بسیار مناسب بلکہ انسب است وموجب احیاء مجالس شریفہ منیفہ است مامول کہ قرین قبول خواہد شد۔ محمد باقر عفی عنہ

الامر کذالک حررہ السید آقا حسن عفی عنہ

السید نجم الحسن

جناب مولانا سبط حسن صاحب قبلہ نے اپنے اساتذہ کا پورا احترام کیا اور تاحیات عشرہ محرم کی دو مجلسیں پانچویں اور نویں پڑھتے رہے علماء کرام اوران کے مخلصین اور عام پبلک اسی ولولہ اور دلچسپی سے مجالس میں شریک ہونا شروع ہوئے اور نویں کی مجلس کا وقار قائم رہا۔

---

(۱) مذکورہ بالا مضمون (امام باڑہ جنت مآب) شیخ تصدق حسین صاحب کے مضامین کو سامنے رکھ کر ایک دوسرے اہل قلم نے تحریر فرمایا ہے۔ جو الواعظ میں مولانا آغا مہدی صاحب کی ادارت میں شائع ہو چکا ہے۔

(ماخوذ از ماہنامہ الواعظ لکھنؤ رمضان المبارک ۱۳۶۵ھ/ اگست ۱۹۴۶ء ص ۱۴۱ تا ۱۴۳)



امامباڑہ نواب امیر محل

یہ امامباڑہ مولوی گنج سے متصل محلہ رسی بٹان میں واقع ہے اس کو سلطان عالم واجد علی شاہ کی زوجہ نواب امیر محل نے داروغہ کرامت حسین، داروغہ نزول سے آراضی خرید کر تعمیر کرایا موصوف حلقہ مولوی گنج کے موجودہ کیل گھر کے پاس رہتے تھے۔

اس کے مصارف کے لئے کچھ جائداد بھی وقف ہے۔

جان عالم نے ان کے ساتھ بزمانہ ولی عہدی متعہ کیا تھا اور تخت نشین سلطنت ہونے پر ان کی تنخواہ دو ہزار روپیہ ماہانہ مقرر کر کے ''خورشید لقا'' کا خطاب بھی عنایت کیا تھا چنانچہ خود فرماتے ہیں۔

پری وہ کہ تھا نام جس کا امیر
حسینان آفاق میں بے نظیر
اسے میں نے اپنی زباں سے کہا
کہ ہے مثل خورشید اس کی لقا
عنایت کئے میں نے ان کو مکاں
ہوئیں پرورش سے بہت شادماں
خواص ان کو میں نے دئے چار چار
رہیں تاشب و روز خدمت گذار

مارچ ۱۸۵۶ء میں جب سلطان عالم حکومت وسلطنت سے محروم ہو کر کلکتہ جانے لگے تو انہوں نے بخوشی خاطر اعلان کر دیا کہ بیگموں میں سے جس کو میرے ساتھ جانا منظور نہ ہو، وہ طلاق لے سکتی ہیں۔ چنانچہ ٦ اللہ کی بندیاں ایسی بھی تھیں جنہوں نے اس آڑے وقت میں طوطا چشمی اختیار کی۔ ان ہی بے وفاؤں اور کج اداؤں میں امیر محل بھی تھیں۔

مرزا رجب علی بیگ سروران بیگموں کا تذکرہ کرتے ہوئے فسانہ عبرت میں تحریر کرتے ہیں: ۱۶؍محرم ۱۲۶۸ھ جان عالم نے اپنی ٦ بیویوں کو امیر محل، سلطنت محل، گلزار محل، گل عالم وغیرہ کو طلاق وزرمہر دے کر آزاد کر دیا۔ سبھوں نے جملہ مال واسباب اور زیور لے لیا اور علیدہ کھانے کا سامان کر لیا۔

شاہ معزول کے کلکتہ تشریف لے جانے کے بعد امیر محل نے بارہ بنکی کے قاضی علی اصغر سے دوبارہ شادی رچائی جن سے تین لڑکے اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔

نواب گنج بارہ بنکی میں امیر محل کی وافر جائداد حسب ذیل ہیں: لکھ پیڑا، سرائے یا دو کانات، موسومہ امیر گنج جس کا دوسرا نام بیگم گنج بھی ہے، امام باڑہ اور مسجد۔

لکھنؤ میں محلہ رسی بٹان سکونتی مکان بھی ہے۔ یہ کل جائداد جان عالم کے روپیہ سے خریدی گئی۔ املاک متذکرہ بالا علاوہ دو گاؤں اور کچھ پٹیاں بھی ہیں جن کی آمدنی ہزار روپیہ ماہوار سے کچھ زائد ہے۔

نواب گنج کی مسجد نہایت عالیشان اور خوشنما ہے اس کے زیریں حصہ میں دوکانات ہیں اور بالائی حصہ میں خانہ خدا ہے جو ۱۲۸۵ھ میں تعمیر ہوا۔ اس میں نواب ناظر تحسین علی خاں کی مسجد واقع چوک لکھنؤ کے مانند دلکش و جاذب نظر منبت کاری ہے۔ مسجد میں قطعۂ تعمیر بھی لگا ہوا ہے جس کا آخری شعر جس سے سنہ تعمیر نکلتا ہے حسب ذیل ہے۔

گفت اختؔر سال تعمیرش چناں
ذکر ایں مسجد ببام آسماں

مگر نواب گنج والا امامباڑہ جو مسجد کے سامنے ہی واقع ہے بالکل مختصر ہے۔ نواب گنج کی کچھ جائداد فروخت بھی ہو چکی ہے مشہور ہے کہ امیر محل اپنی حیات میں مجالس کے حصے بڑی حوصلہ مندی سے تقسیم کرتی تھیں شیر برنج کی بڑی بڑی قفلیاں اور پلاؤ کے بڑے بڑے طباق مدعو اشخاص کے یہاں قبل سے بھجوا دیتی تھیں۔

امیر محل صاحبہ نے اس امامباڑہ میں بڑی شاندار اور قابل ذکر مجلسیں کیں عشرۂ محرم کی مجلسوں میں پانچویں کی مجلس بڑی دھوم سے ہوتی تھی۔ ان مجالس میں لکھنؤ کے مشہور ذاکر میر محمد شاہ صاحب مرحوم پڑھتے تھے ان کے مرنے کے بعد مولوی میر سید علی صاحب محدث ذاکری فرماتے تھے۔

میر محمد شاہ صاحب مرحوم دوہرے بدن کے تنومند شخص تھے۔ امیر محل صاحبہ نے ان کے لئے خاص طور پر مضبوط اور مستحکم چوبی منبر بنوایا تھا۔ یہ منبر اس وقت مسجد تحسین چوک میں موجود ہے اور تیرہ رجب کی محفل اور مسجد کی ہفتہ وار اور ماہوار مجلسیں اور اتوار کا موعظہ اسی منبر پر ہوتا ہے۔

امامباڑہ امیر محل کے ذاکرین میں بندہ حسن صاحب سوزخوان باقی تھے۔ ان کا بھی گذشتہ سال انتقال ہو گیا۔

امیر محل صاحبہ اپنے زمانہ میں بہترین خوشنویس تھیں اور عربی خط نسخ میں ان کو کمال حاصل تھا۔ ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک قرآن مجید (چوب قلم) ان کی صحیح یادگار تھی مگر افسوس ہے کہ قابل قدر مخطوطات باقی نہ رہے۔ اس قرآن شریف کا گیارہواں پارہ اور کچھ متفرق اوراق باقی تھے جو محترمہ کے بڑے صاحبزادے نواب امجد علی خاں صاحب مرحوم نے بحیثیت ایک عالم دین مولانا آغا مہدی صاحب قبلہ کو مرحمت کئے۔ میں نے بچشم خود اس قرآن شریف کی زیارت کی جو مولانا کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ ماہ رمضان کی متبرک تاریخوں میں امیر محل صاحبہ کی طرف سے مسجدوں میں افطار کا بھی سامان ہوتا تھا۔

موصوفہ نے بتاریخ ۲۴ رجب ۱۳۱۰ھ انتقال کیا۔ ان کی قبر کربلائے میر خدا بخش میں داخل ہوتے ہوئے زنجیری پھاٹک سے بالکل متصل داہنی جانب صحنچی میں ہے جس پر قطعۂ تاریخ حسب ذیل نصب ہے:۔

فغاں ازیں فلک تیرہ رائے زشت عمل
کہ عیش صاف دلاں می کند بغصہ بدل
سترده سایۂ مجذومہ جہاں از سر
بہ راحت دل بے طاقتاں فگند خلل
بلند مرتبہ خاتون پاکدا مانی
خجستہ بانوئے واجد علی شہ عادل
جمیلۂ کہ بنا زد بگوہر ش خوبی
عفیفۂ کہ چومریم بعفت ست مثل
بقدر ہمت او حلیۂ عطا زیبا
نشان طینت وے آیہ صفا منزل
تفاوت از کرمش تابجود حاتم طے
چناں بود کہ میان مصلیٰ و محمل
نہ بست و چارم ماہ رجب چوں صبح امید
نمرد شمع حیاتش بہ تند باد اجل
پئے زیارت بنت رسول رفت بخلد
کہ بود شیفتۂ آل احمد مرسل
بہ لو سر قد پالش نوشتۂ کلک صفیؔ
واز بیگم جمشید قدر امیر محل

نواب امجد علی خاں صاحب کو بھی ماں کی طرح عزاداری اور اس امامباڑہ کو فروغ دینے کا ہر وقت خیال تھا۔ موصوف نے اس امامباڑہ کی نگرانی اور مجالس کا انتظام سید واجد علی

(بقیہ صفحہ نمبر ۴۲ پر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔)

بیان کرنے سے گریز کیا ہے اور معائب تلاش کرنے کی زیادہ سے زیادہ شعوری کوشش کی ہے۔

''نگارشاتِ رنگ رنگ'' مولانا محمد باقر شمسؔ صاحب کے پرمغز اور علمی مقالات و مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین زیادہ تر زبان و بیان اور لسانیات سے متعلق ہیں ۔ مثلاً تخلیقِ زبان کا فلسفہ، زبان کے مرکز کا فلسفہ، متروکات کا مسئلہ ،عطف و اضافت کا مسئلہ وغیرہ ۔ اس کتاب کا مقدمہ مدیر ''طلوعِ افکار'' جناب حسین انجم نے لکھا ہے اور اس کی ترتیب و تدوین بھی انھوں نے ہی کی ہے۔ مقدمہ ''تعارف'' کے عنوان سے لکھا گیا ہے ۔ ''تعارف'' میرے نزدیک اس لئے اہم ہے کہ اس میں مولانا موصوف کی شخصیت پر زیادہ سے زیادہ مواد نہایت شائستہ انداز میں پیش کیا گیا ہے ۔ مولانا کی ہمہ گیر شخصیت اور حسین انجم صاحب کے جاذبِ اثر اسلوب نگارش کے سبب ''تعارف'' کو میں ایک قابلِ ذکر ادب پارہ قرار دیتا ہوں۔

شکستِ آئینہ، فلسفۂ خیام، درِ منظوم بھی ایسی تخلیقات ہیں، جن سے حضرتِ شمسؔ کے اجتہادی ذہن اور اعلیٰ علمی و ادبی مذاق کا پتہ چلتا ہے۔ ''انتخابِ دیوان جاوید'' اگرچہ کوئی تخلیقی کام نہیں ہے، لیکن اس کی تالیف کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس کتاب پر علامہ نیاز فتحپوری نے لکھا ہے:

''اسلام پر کیا گذری'' مولانا کی ایک ایسی کتاب ہے، جو انھوں نے قرآن و احادیث اور تاریخ کے حوالہ سے لکھی ہے۔ چونکہ مولانا کو اسلامیات ،فلسفہ ،منطق اور مشرقی ادبیات پر دسترس ہے، اس لئے ان کی ہر تخلیق قابلِ ذکر ہے۔

میں نے انتہائی اختصار سے حضرتِ شمسؔ کی شخصیت اور تخلیقات پر تبصرہ کیا ہے، ورنہ ان کے افکار پر باقاعدہ صراحت سے لکھا جائے تو کئی کتابیں لکھی جاسکتی ہیں ۔ مولانا کا دم اس دور میں غنیمت ہے ۔ خداوندِ تعالیٰ انھیں صحتِ کاملہ عطا فرمائے اور شاداں رکھے! آمین

ماہ خدائے جہاں

ندیؔ الہندی

ماہ توبہ ماہ بخشش ماہِ احساں ہے یہی
ماہِ دیں ماہِ شریعت ماہِ ایماں ہے یہی
ماہِ طاعت ماہِ شفقت ماہِ مہماں ہے یہی
ماہِ قاری ماہِ قرأت ماہِ قرآں ہے یہی
بحرِ عصیاں میں غریبوں کو سفینہ بن گیا
افضلیت یہ کہ خالق کا مہینہ بن گیا



(بقیہ صفحہ ۳۵ کا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔)

صاحب کے سپرد کیا تھا جو سبحان نگر لکھنؤ کے رہنے والے اور مدرسۂ ایمانیہ کے آخری متعلم تھے مدرسہ ایمانیہ عہد شاہی کا وہ قدیم مدرسہ تھا جو علماء لکھنؤ کی نگرانی میں جاری ہوا تھا۔

نواب صاحب ممدوح نے اس امامباڑے کی کڑیوں دار سقف کو کہنہ ہو جانے سے نئے طرز کی ڈانٹ دے کر بدل دیا امامباڑے کے تبرکات میں کچھ مرقع اور بزرگان دین کی قلمی تصویریں بھی ہیں جن کو موصوف کربلائے معلی بھیجنا چاہتے تھے مگر عمر نے وفا نہ کی اور پیمانہ حیات لبریز ہوگیا۔

اس امامباڑہ میں ہر مہینہ کی ۲۴ کو نواب امیر محل صاحبہ کے بروز انتقال مجلس ہوتی ہے اور ان کے خاندان کے دیگر افراد کی تاریخہائے انتقال میں بھی ویسے ہوتے ہیں اور محلہ کی ماتمی انجمن ماتم حسینی رجب اور بقرعید کی نوچندی کو علم اٹھا کر درگاہ لے جاتی ہے۔

ماخوذ از ماہنامہ الواعظ لکھنؤ رجب ۱۳۶۷ھ/مئی ۱۹۴۸ء ص ۱۲ تا ۱۵/

